اسلام کی اصلاحی وتعمیری حکمتِ عملی

محمد شعیب*

ABSTRACT:

The Holy Prophet (peace be upon him) had brought the biggest revolution in the history of mankind. Its basic reason of success is this that he observed their good and bad habits for forty years. He used to see all their right and wrong activities as a perfect doctor, then prescribed proper medicine.

He did not start any reform movement before the announcement of his prophethood, when he started reform movement , he did not cover all their wrong things at once but first of all he refined their innerself and made a group and nation of reformed and cultured people. It took a lot of time. Secondly when a sufficient number of people prepared then revolutionary orders and commands were revealed.

Therefore, the third principle became clear that he continued his efforts gradually to complete their refining in the society from the aspect of faith, believe and worship.

The fourth principle which was highlighted is unity. The people who were prepared for the social reforms were united like a strong rope. Even Allah (SWT) praised and admired their discipline.

These are some important and basic principles. Present article discuss these principles briefly.

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بھیجے ہوئے انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کے ذریعے بنی نوع انسان کے لیے رشد وہدایت ورہبری کا انتظام فرمایا اور اس امر کا عندیہ دے دیا گیا تھا، جب حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے لیے زمین کو مسکن بنادیا گیا اور آپ علیہ السلام کی زمین کی طرف رخصتی کا عمل شروع ہوا۔ارشاد ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعاً فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o (البقرۃ:۳۸)

''تو ہم نے کہا تم یہاں سے اتر جاؤ تو جب بھی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آپہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی اتباع کریں گے انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی غمزدہ ہوں گے۔''

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ رشد وہدایت کی یہ بہم رسانی روز اول سے ہی طے شدہ تھی اور زمینی حقائق بھی اس امر کی تائید ہی کرتے نظر آتے ہیں۔انسانی آبادی میں بگاڑ بہت تیزی سے سرایت کرتا ہے۔اصلاح وتعمیر خاصا دقت طلب معاملہ ہوتا

* ریسرچ اسکالر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی، کراچی برقی پتا: dr_ma_saqi@yahoo.com
تاریخِ موصولہ: ۱۵/مارچ ۲۰۱۲ء

ہے۔قریشِ مکہ ہی کو لیجیے سب سے بڑے بت شکن حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور خانہ کعبہ، میراث پدری کے اصول کے تحت ہی انہوں نے بنوخزاعہ سے واپس اپنی ولایت ونگرانی میں تھا مگر یہی فرزندانِ توحید، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت تک ناخلفی کی اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ سرتاپا بت پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔سید امیر علی ہمدانی لکھتے ہیں:

عربوں کی اکثریت بتوں اور ستاروں کی پرستش کرتی تھی۔ ہر قبیلے کی طرح ہر شہر کے اپنے دیوی دیوتا، عبادت گاہیں اور عبادت کے طریقے الگ الگ تھے۔مکہ جو عربوں کی قومی زندگی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا، روم یا بنارس کی طرح تھا۔وہاں کعبہ کی عبادت گاہ میں تین سوساٹھ بت تھے۔یہ ان تمام دیویوں، دیوتاؤں کی نمائندگی کرتے تھے جن کی عرب پرستش کرتے تھے۔(۱)

چنانچہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک انبیائے کرام کی آمد و بعثت کا سلسلہ جاری وساری رہا اور اللہ کے فرستادہ ہادیان برحق فیض رسانی کا منبع وسرچشمہ بنے رہے۔آخر میں رسول مکرم ﷺ تشریف لائے اور آپؐ پر آ کر یہ سلسلہ نبوت اختتام پذیر ہوگیا۔لہٰذا تاریخ کے قدیم وعمیق ادوار میں بھی قدرت کا یہ انتظام اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی آدم کے لیے انہی میں سے کچھ برگزیدہ ہستیوں کا انتخاب فرمایا اور ان کو اصلاحی و تعمیری عمل پر مامور فرمایا۔پھر حین حیات تک یہ بزرگ، لوگوں کی بھلائی و بہتری کی خاطر جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کا پیکر مجسم بنے رہے۔اس سارے عمل کی مثال فی زمانہ ایسی ہی ہے کہ حساس و پیچیدہ مشینیں اور آلات تیار کرنے والی کمپنیاں ایک تعارفی کتابچہ بھی اپنی مصنوعات کے ساتھ کر دیتی ہیں۔ یہ کتابچے طریق استعمال سمیت جملہ ضروریات ہدایات پر مشتمل ہوتے ہیں۔دی گئی ہدایات پر پورے طور سے عمل کرنے کے باوجود کوئی نقصان ہوجائے تو اس نقصان کی ذمہ داری کمپنی کے سر ہوتی ہے۔مگر لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں صارف خود ذمہ دار ہوتا ہے۔زمانوں تجربے کرنے کے بعد بالآخر ہمارے عہد کے لوگوں نے اس کتابچہ کی ضرورت واہمیت کا احساس وادراک کیا مگر یہ سنت الٰہیہ نامعلوم وقتوں سے فیض رسانی کا منبع وسرچشمہ رہی ہے۔چنانچہ تبلیغ و پرچار اور تعمیر واصلاح کے عمل کی ناگریزیت تسلیم شدہ ہے۔کسی دور کے انسان کے لیے اس سے مفر نہیں ہے۔آپؐ سے پہلے کے انبیاء نے بھی اپنے اپنے عہد میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔مگر جو فتح ونصرت آپؐ کے حصے میں آئی اس کی شان ہی اور ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اب قیام قیامت تک حقیقی معنوں میں بس آپؐ کی لائی ہوئی شریعت اور تعلیمات ہی لائق اتباع اور بنی نوع انسان کے لیے حیات بخشی کی ضمانت دینے کی قوت وصلاحیت اپنے اندر رکھتی ہیں، اہل ایمان تو اس امر سے بخوبی واقف ہیں رہی باقی دنیا کی بات تو وہ بھی ان شاءاللہ بہت جلد اس حقیقت کا ادراک کرلے گی۔خوش آئند پیش گوئی پر مبنی ان فقرات کے تعلق سے معروف مفکر و دانشور مختار مسعود کی کتاب آواز دوست کا یہ اقتباس، جس میں فلسفہ تاریخ کے معروف ومشہور مغربی مفکر ''ٹائن بی'' کا حوالہ آیا ہے، بہت معنی خیز اور قابل غور ہے:

''اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعاً (المائدہ:۱۰۵) سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ٹائن بی نے بھی تو تاریخ عالم کی طویل داستان پڑھنے، اس پر عمیق غور کرنے اور اس کا دقیق تجزیہ کرنے کے بعد اپنے مطالعہ تاریخ کو اسی آیت پر ختم کیا ہے۔

اسلام پر ایمان لانا ہوتو وہ ٹائن بی کی معرفت بھی لایا جاسکتا ہے۔"(۲)

اپنی اصل کے لحاظ سے یہ پیش گوئی اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فیصلہ سے مستعار ہے جو بہت واضح اور دوٹوک الفاظ میں قرآن حکیم میں وارد ہوا ہے جو ہر غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡناً فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (ال عمران:۸۵)

"اور جو کوئی بھی اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔"

آج جب تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ بیت گیا ہے تو ہم پلٹ کر تاریخ کی راہداریوں پر جب بھی نظر ڈالتے ہیں تو ایک چیز بہت واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ جب بھی لوگ ان تعلیمات الٰہیہ کے قریب ہوئے ان کو زندگی میں عزت وراحت اور امن وسکون کی نعمتوں سے سرفرازی ملی اور جب بھی دوری ومہجوری کے مہیب سائے اس قوم کے سروں پر لہرائے ہیں تو اپنے ساتھ آفتیں اور قیامتیں ہی لے کر آئے ہیں۔اس کھلی حقیقت نے اس امت کی اس حوالے سے آنکھیں کھول دی ہیں کہ دعوت وتبلیغ کا عمل ہر دور کی لازمی ضرورت اور ایک مقدس پیغمبرانہ ذمہ داری ہے جس سے فرار یا بے اعتنائی پوری قوم کو مہیب ومہلک خطرات کی طرف دھکیل دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خیر وبھلائی کے لیے"معروف"اور شر اور برائی کے لیے"منکر"جیسی وسیع البنیاد اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے قرآن حکیم نے اُمت محمدیہ کو تمام امم میں بہترین امت کے عظیم لقب سے نوازنے کے بعد اس امت کا فرضِ منصبی اور وظیفہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ارشاد ہے:

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (ال عمران:۱۱۰)

"نوع انسانی میں جو قومیں وجود میں آئی ہیں تم لوگ ان سب سے بہتر ہو،معروف کا حکم دیتے ہوئے اور منکرات سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

چنانچہ بھلائی کی طرف رغبت ومیلان کے اسی فطری جذبے کی بیداری کی ضرورت کے احساس وادراک کے تحت ہی ملت اسلامیہ ابھی پچھلی صدی کے وسط میں ہی ایک بے رحم عالمی استعماری تسلط پر مبنی ظالم سامراجی نظام کے خونخوار جبڑوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے اور اس نوآبادیاتی نظام کی کہنہ زنجیروں سے آزادی کے حصول کے بعد یہ امر بھی بہت خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے کہ اب اگلی منزل یعنی ذہنی وفکری اور معاشی واخلاقی غلامی سے بھی نجات حاصل کرنے کی جانب مائل ومتوجہ ہورہی ہے۔ایسے میں ہمیں ادھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ہمارے لیے رسول اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کو بہترین نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے۔(۳) لہٰذا بہر اعتبار ہماری دنیوی زندگی کا مدار اور اس کا محور قرآن حکیم اور سنت رسولؐ ہے۔آپؐ کی حیات طیبہ کے شب وروز مندرجہ ذیل حکم ربانی کی مجسم تعبیر وتفسیر اور رہتی دنیا کے لیے خزینہ حکمت ودانش ہیں:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَ الۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ اِنَّ رَبَّکَ

هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَاَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ (النحل:۱۲۵)

''(اے رسول مکرم) تم بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کی راہ پر دانش اور اچھے وعظ ونصیحت کے ذریعے اور ان کے ساتھ بحث مباحثہ کا وہ انداز اختیار کرو جو سب سے عمدہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ تمہارا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بہک گیا اور انہیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔''

طریق دعوت واصلاح پر باقاعدہ گفتگو کے آغاز سے قبل اس سوال کا جواب حاصل کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ صلح اور اصلاح کا حقیقی مصداق کیا ہے؟ معلوم رہے کہ ہر لفظ کا اپنا ایک حقیقی اور لغوی معنی ہوتا ہے۔آگے چل کر کئی الفاظ کو اصطلاحی تعبیر ومعنی کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔لغوی اور اصطلاحی معنی میں نمایاں فرق آجاتا ہے۔پھر حقیقت تک رسائی تب ہی ممکن ہوتی ہے جب ان کو ان کی اصل کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔وہ عامۃ الناس کی اس غلط فہمی کی وجہ سے کسی لفظ کے معنی کی اصل میں ضم ہو جانے سے معاملہ ان چاہی راہوں کی طرف نکل جاتا ہے۔لفظ صلح کے معاملے میں بدقسمتی سے کچھ ایسی ہو رہا ہے۔دو اشخاص یا متحارب فریقوں کے درمیان صلح کا یہ طریق رائج ہو گیا ہے کہ اثر ورسوخ وغیرہ استعمال کر کے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ دونوں مل بیٹھنے پر مجبور ہو جائیں۔بظاہر اس عمل میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر حقیقت میں اس طرح کی صلح بڑے فتنوں کو جنم دیتی ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ راست بنیادوں پر دونوں کے مابین النزاع کا خاتمہ کیے بغیر ان کے باہم مل بیٹھنے کو صلح کا نام دے دیا جاتا ہے۔فساد کی جڑ کا جب تک خاتمہ نہ ہو جائے ایسے ہوگا کہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہے گی اور جھگڑے کی بنیاد کو بچائے رکھے گی۔جیسے ہی کسی فریق کو اپنا غم وغصہ نکالنے کا موقع ہاتھ آئے گا وہ ضرور طبع آزمائی کرے گا۔بہت مرتبہ تو ایسی صلح قتل وغارتگری پر جا کر منتج ہوتی ہے۔لہٰذا دراصل صلح نام ہے''خرابی فساد کے دور ہونے'' کا نہ کہ''اوپر سے پٹی رکھ کر زہریلے ناسوروں کو چھپا دینے'' کا۔اسی سے مشتق ہے لفظ''اصلاح''۔''خرابی اور فساد کو دور کرنے کے عمل کو اصلاح کہا جاتا ہے۔'' قرآن حکیم میں جہاں جہاں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے انہی معانی میں ہوا ہے۔معاملات کو سرسری دیکھنے اور متخاصم فریقوں کے سر جوڑنے کے معنی میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔صُلح اور اِصلاح اصل میں ضد ہیں۔فَساد اور اِفسَاد کی۔بلیاوی نے اول الذکر کا حسب ذیل معنی بیان کیا ہے:

''درست ہونا'' اور ''درست کرنا''...... ''صلح کرانا'' (۴)

جبکہ ثانی الذکر کا معنی یہ کیا ہے:

''خراب ہونا یا بگڑ جانا'' اور ''خراب کرنا یا بگاڑنا'' (۵)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۝ (البقرۃ:۱۱)

''اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو بس اصلاح کار ہی ہیں۔''

اس کا صاف مطلب ہے کہ اسلام کی نظر لوگوں میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنے پر ہے۔ یہ خرابیاں کئی طرح کی ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر فکر وخیال کی خرابیاں، شخصی واجتماعی افعال واعمال کی خرابیاں، اسی طرح زبان وبیان کی خرابیاں، رہن سہن، اوڑھنے پہننے کی اور عادات واطوار کی خرابیاں وغیرہ۔ ظاہری بات ہے کہ جب کسی انسان پر یہ بات پوری طرح واضح ہوجائے کہ اس کے فلاں عمل میں فلاں خرابی ہے تو زیادہ دیر تک اس کا اس کے ساتھ چمٹے رہنا اور جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ دیرینہ معمولات وروایات سے ہٹنا عام لوگوں کے لیے خاصا کٹھن اور دشوار ہوتا ہے۔

البتہ غیر حسی اور فکری معاملات میں لوگوں کے اپنے اپنے رجحانات ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل ایمان کے لیے قرآن حکیم اور سنت رسولؐ ہی ایک معتبر میزان ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (النساء:۵۹)

''تو اگر تمہارے درمیان کوئی تنازع کھڑا ہوجائے تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔''

رسول اکرمؐ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع، جو حقیقی معنوں میں جملہ تعلیمات اسلامی کا ایک نفیس خلاصہ اور نچوڑ ہے، میں ارشاد فرمایا:

''میں نے تم لوگوں کے درمیان ایک ایسی چیز رکھ دی ہے کہ اگر تم صحیح طور پر اس سے وابستہ رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوں گے۔ اپنے ہر معاملے کو اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مابین رکھنا۔''(۶)

لٰہذا ہم زیر نظر مضمون میں جہاں کہیں بھی فساد اور خرابی کی بات کریں گے تو اس سے ہماری مراد تعلیمات مصطفوی سے دوری ومہجوری ہوگی اور اصلاح کا ذکر کریں گے تو ہمارے پیش نظر قرآن وسنت کی جانب ازسرنو مراجعت اور شریعت اسلامی کے مہیا کردہ سانچوں میں خود کو ڈھالنے کا عمل ہوگا۔

ایک انسان کی زندگی اور ایک قوم کی زندگی میں یہی فرق ہے کہ افراد کی عمریں محدود ومختصر ہوتی ہیں اور قوموں کی زندگیاں طویل تر۔ ورنہ خوشی وغمی، صحت وبیماری، بلند اقبالی وپست خیالی ایسے عناصر کا حملہ دونوں پر ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ان حملوں کا تھامنا اور ان کا سامنا کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ پچھلی چند صدیوں میں عالمی سطح پر دیگر اقوام کے مقابلے میں مسلمان جس طرح سے مغلوب ہوگئے تھے، اس کیفیت نے مایوسی اور بے دلی جیسے منفی رجحانات فروغ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اغیار کے ہاتھوں مسلم مذہبی واخلاقی، معاشی واقتصادی، سماجی ومعاشرتی اور تہذیبی وثقافتی اقدار وروایات کا استیصال اس قدر تباہ کن تھا اور ہمہ گیر تھا کہ ملت اسلامیہ کی حیات نو کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ ہمارا خالص مذہبی فکر ورجحان رکھنے والا طبقہ بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بڑی حد تک ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہوگیا۔

مگر اسلام کا جوش نمو جاودانی نوعیت کا ہے اور یہ قوم بھی جفاکش اور سخت جان ہے۔ اس قوم کی تاریخ ابتلا وآزمائش، مصائب وآلام اور حوادث وسانحات سے بھری پڑی ہے۔ اگر معرکہ خیر وشر کی جولانیاں تابہ قیام قیامت جاری وساری

رہیں گی تو ماننے کی بات ہے کہ نشیب وفراز تو خیر امم کی تاریخ کا لازمہ یقینی طور سے ہوں گے۔

قرآن حکیم نے اللہ کی رحمت سے مایوسی کو ممنوعات کی فہرست میں شامل رکھا ہے۔ یہ بات بھی مسلمہ قدر کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح مکافات عمل قانون قدرت ہے۔ برائی اور بے راہ روی کے رجحانات معاشرے کو بدحالی اور ابتری کی طرف دھکیل دیا کرتے ہیں۔ اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ نفسانفسی اور افراتفری کا عالم ہو اور شرم وحیا کے قدرتی وفطری پہرے بھی غیر موثر ہو جائیں تو بہت سے بھلے لوگ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے چل پڑتے ہیں۔ اس رجحان سے بھلائی پیچھے رہ جاتی ہے اور برائی کو تقویت اور فروغ ملتا ہے۔ پھر نقصان شخصی وانفرادی نہیں رہ جاتا بلکہ اجتماعی سطح پر چھا جاتا ہے۔ یا غالب اکثریت جب اس سے دوچار ہوتی ہے تو لوگ آنکھیں کھولنے اور پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان پاک ٹوٹے دلوں کے لیے نئی زندگی نوید بن جاتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ وَ اَنَّہٗٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَo (الانفال:۲۴)

"اے ایمان والو! اللہ کے اور رسول کے بلاوے کو دل وجان سے قبول کیا کرو جب کہ رسول تمھیں ایسی چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں جو تمھیں حیات جاوداں عطا کرتی ہے اور تم لوگوں کو معلوم رہے کہ اللہ آدمی اور اس کے دلی ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب اس کے روبرو پیش کیے جاؤ گے۔"

یہ فرمان پاک بھی آیت متذکرہ بالا کے متصل آیا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَآصَّۃً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِo (الانفال:۲۵)

"اور ڈرتے رہو اس فتنہ وآزمائش سے جو تم میں سے چن چن کر بس انہی لوگوں کو نشانہ نہیں بنائے گا جو کہ ظالم ہیں اور تم لوگوں کو معلوم رہے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

قرآن حکیم نے بڑے دل نشیں پیرائے میں تعمیر وتخریب کے تعلق سے معرکہ خیر وشر کے بنیادی اصول متعارف کروائے ہیں۔ واقعاتی شہادتوں کی حوائج وحوادث کو معرض بیان میں لاکر بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ اپنے موقف کی صحت پر اس نوعیت کا استدلال بھی بہت زوراثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کے چند مقامات کو ایک ترتیب میں لاکر دیکھ لیجیے۔ ارشاد ہے:

(۱) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ط وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا ط وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًاo لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ ط مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ لا وَ لَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًاo (النساء:۱۲۲-۱۲۳)

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح پر کاربند رہے عنقریب ہم انہیں باغوں میں لے جائیں گے

جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوسکتی ہے۔ معاملات نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوتے ہیں نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے موافق، جو بھی برا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا، اور اس معاملے میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا حامی ومددگار نہ پائے گا۔''

(۲) وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَo (البقرہ:۱۵۵)

''اور یقیناً ہم آزمائیں گے تم لوگوں کو کسی خوف اور بھوک سے اور اموال، جان اور پھلوں کی کمی کے ذریعے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دیجیے۔''

(۳) اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَo (التوبۃ:۱۲۶)

''کیا یہ غور نہیں کرتے کہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائش میں ڈال دیے جاتے ہیں پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔''

(۴) ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَo (الروم:۴۱)

''فساد طاری ہوگیا ہے بحر وبر میں ان برائیوں کے باعث جن کا ارتکاب لوگوں نے اپنے ہاتھوں (دیدہ ودانستہ) کیا ہے اس غرض سے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ وہ باز تو آئیں۔''

(۵) اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیْرًاo (النساء:۱۳۳)

''اگر وہ چاہے تو، اے لوگو، وہ تمہیں منظر سے ہٹا دے اور دوسروں کو لے آئے اور اللہ کو اس امر پر قدرت حاصل ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ تباہی کی راہ پر نکل گئے ہیں کیا ان کی واپسی اور بحالی کے تمام راستے مسدود ہوتے جائیں گے یا حیاتِ نو اُمید کی کوئی کرن ایسی باقی رہتی ہے جو ان خستہ حال اور تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی زندگیوں کو جلا بخشے اور پھر سے جگمگا دے تو بارگاہ کریمی کی شان رحمت جواب دیتی ہے۔

(۶) قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُo (الزمر:۵۳)

''(اے رسول مکرم) آپ فرما دیجیے میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہوں۔ یقیناً اللہ سب گناہ بخش بھی دیتا ہے یقیناً وہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

آیات مندرجہ بالا سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ عروج وزوال قوموں کی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔ فکر وعمل کی

نفاست اور پاکیزگی افراد اور لوگوں کی صحت وتندرستی کی ضامن ہوتی ہے اور افراد ہوں یا قومیں، زوال پذیر تب ہوتے ہیں جب ان کے نظامِ فکر وعمل میں خرابیاں در آتی ہیں۔ اگر اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے اور تلافی وتدارک کی تحریک پیدا ہو جائے تو حالات کو نئے رخ پر ڈالنا ممکن ہو جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ نوعِ انسانی اپنے ابنائے جنس کے ہاتھوں ہی ستائی گئی ہے۔ وہ ابنائے جنس جو خود ساختہ طور پر معمار بن بیٹھے تھے۔ ندوی لکھتے ہیں:

''نوعِ انسانی اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ خود ساختہ رہنماؤں اور برسرِ اقتدار شخصیتوں کا کھیل اور مذاق اور قانون سازوں اور حکما کے تجربات کا کھلونا بنتی رہی ہے۔ ایسے لوگوں نے اپنے ابنائے جنس اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بچہ کاغذ کے کسی پرزے کے ساتھ کرتا ہے۔ کبھی کاغذ کو لپیٹتا، کبھی پھیلاتا، کبھی کھولتا، کبھی بند کرتا اور جب جی چاہے پھاڑتا اور جلا ڈالتا ہے۔''(۷)

ان تجربات نے لوگوں کی طبیعتوں پر بہت گہرے اور دیرپا نقوش بھی چھوڑے ہیں۔ کئی مرتبہ تو محتاط روش کو چھوڑ کر انسان نے اپنے ماضی سے بیگانگی زدہ بیزاری کا رویہ اختیار کر لیا۔ سولہویں صدی عیسوی اور زمانہ مابعد کے مغربی مفکرین کی ذہنی زور آزمائی اور اس کے نتائج کے تعلق سے ڈاکٹر ظفر لکھتے ہیں:

''ہر شخص آزاد اور خود کو یگانہ سمجھنے لگا تو تمام قائم شدہ رشتے اور نسبتیں ٹوٹ گئیں اور پرانی قدریں پامال ہونے لگیں۔ اس طرح ایک نئے قسم کا انسان وارد ہوا جو اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر علاقہ منقطع کرنے پر مصر تھا۔ سترہویں صدی میں جو نیا کائناتی تصور قائم ہوا اور ایک نئے انسان نے جنم لیا تو اس کے نتیجے میں انسان کے رجحانات اسے مادہ پرستی کی طرف راغب کرتے گئے۔''(۸)

اس رجحان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے دیگر نمایاں رجحانات ہر شخص، ہر شے اور ہر چیز پر تنقید وتضحیک کی لت، عقل اور معلومات عامہ پر زور، خدا کے خوف میں ضعف، سائنس پر بڑھتا ہوا انحصار، وحی اور روحانی معاملات سے بددلی، ''خداپرستی'' لادینیت اور بالآخر ایک فطری مذہب کی تلاش ہیں۔ آخرکار اخلاقیات کا زور بڑھتا گیا اور مابعد الطبیعیاتی علوم ختم ہو گئے۔''(۹)

اسلامی دنیا پر مرتب ہونے والے یا اس کایا کلپ کے تباہ کن اثرات کی ہمہ گیری کی طرف متوجہ کرتے ہوئے امین اصلاحی لکھتے ہیں:

''مغرب کے لادینی اثرات کے تحت، جو اٹھارویں صدی کے اواخر میں پوری طرح زور پکڑ گئے، عموماً مسلمان حکومتوں نے بھی غیر اسلامی قوانین اختیار کرنے شروع کر دیے۔ ایک محدود دائرہ کے سوا اجتماعی وسیاسی زندگی کے ہر گوشہ میں وضعی قوانین دخیل ہو گئے۔ جن مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کا تسلط ہو گیا وہاں اسلامی قوانین کا

پڑھنا پڑھانا بھی محض عربی مدرسوں میں بطور تبرک ہی رہ گیا۔''(۱۰)

ایک طرف اعدا و اغیار اس قوم کی بنیادی قدروں اور تہذیبی وثقافتی اثاثوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے برباد کررہے تھے اور اس قوم کو نیست نابود کرنے اور صفحۂ ہستی سے مٹادینے پر تلے ہوئے تھے تو دوسری طرف اپنی غفلت کا یہ عالم تھا کہ اس انحطاط و ابتری اور بدحالی کے دور میں مسلمانوں کے منافرتیں اور آویزشیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔حتی کہ مسلسل ومتواتر جاری رہنے والی ایک دائمی طور پر سلگتی خانہ جنگی کی صورت بن گئی اور یہ کیفیت آخری کیل ثابت ہوئی۔دنیا کے نقشے پر اس وقت پانچ درجن سے زائد آزاد وخود مختار مسلم ممالک موجود ہیں مگر کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہو کہ وہ فرقہ واریت کے عفریت کی دست برد سے محفوظ ہے۔حد یہ ہے کہ جن امور کی ملت کا حیاتِ اجتماعی کے مقاصد ومفادات سے دور کا واسطہ بھی نہیں بنتا تھا ان کو اصول دین کا درجہ اور مقام دے دیا گیا۔ہر گروہ اپنے بنائے ہوئے اسی محور کے گرد گھوم رہا ہے اسی کی ترقی وفروغ کو ملت کی حیات اجتماعی کی مشکلات کا حل بتانے پر مصر ہے۔اعدا واغیار کے نرغے میں رہ کر باوقار انداز میں جینے کے لیے ناگزیر یکجہتی وہم آہنگی پر مبنی ایک قومی زندگی کے لیے تفریق وانتشار کی ضرر رسانی اور تباہ کاریوں کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔اتحاد ویگانگت، یکجہتی وہم آہنگی کے لیے زبانی دعوے تو بہت ہیں مگر اس راہ کی مشکلات کو دور کرنے کے تعلق سے ضروری، مضبوط وموثر اور مربوط نوعیت کے ٹھوس عملی اقدامات کہیں نظر نہیں آتے۔ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس فرقہ واریت کا ایک جامع نقشہ سطور ذیل میں پیش کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''مذہبی طبقہ فرقہ پرستی کے منصب مستمرہ کو برقرار رکھنے پر مصر ہے اور فرقہ پرستی، بے جان عقائد، کمزور رسوم، مفاپرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ حق پرستی سمجھنے اور متحد ہونے کو کفر جاننے سے عبارت ہے۔''(۱۱)

آیات بالا کے تسلسل پر ایک عمیق تر نظر اور تاریخ انسانی کے ایک گہرے مطالعہ کو ملا کر دیکھا جائے تو ایک اور بات یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ جس فکر وفلسفہ کی بنیاد پر قوم کی تشکیل وتجسیم ہوئی ہے اس کے اندر اتنی جان اور اتنا دم خم بھی ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں بلکہ اغیار کو اپنی طرف مائل کرسکے اور اپنی تاثیر سے انہیں قائل کرکے اور اپنا گرویدہ بنا کر اپنے زیر اثر لاسکے۔فتنۂ تاتار نے جو کاری وار کیا تھا، یہ سخت جان قوم یہ زخم بھی سہ گئی تھی۔اس فتنے کی شدت وحدت اب تک برقرار رہی جب تک اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت تھی۔واقفیت ملی تو مسلمانوں کے عمل کی کوتاہی اپنی جگہ مگر یہ نظریہ اس قدر طاقت ور تھا کہ اس نے ہی تپتے ریگزاروں کو گلزار بنا کر ہی دم لیا۔پھر دنیا نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اسی بت خانے سے کعبے کی پاسبانی کے ساماں مہیا ہوگئے۔

بہر حال عروج وزوال کی دونوں حالتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ اہل ہمت ہر دور میں کلمہ حق بلند کرنے اور اپنی قوم و ملت کو اور پھر پوری نوع بشر کو بلند دیکھنے اور رکھنے کا عزم مصمم لیے میدان عمل میں کھڑے نظر آتے ہیں اور فقط اللہ کے آسرے پر اپنی تگ ودو جاری رکھتے ہیں۔پھر اس کارواں میں اور لوگ بھی شامل ہوتے جاتے ہیں اور نئے نئے اسباب اور مواقع بھی مہیا ہوتے رہتے ہیں۔تب کامیابیاں بھی آگے آتی ہیں۔صلہ وانعام کی بات ہو تو قدرت اور تاریخ دونوں کی

آنکھ کا تارا بن جاتے ہیں۔قدرت ان کو عزت وشرف سے نوازتی ہے اور تاریخ ایسے لوگوں اور ان کے کارہائے نمایاں کو لوگوں کے حافظے سے محو نہیں ہونے دیتی۔ یہ انعام فی الواقع اتنا گراں قدر ہے کہ لوگوں کے دلوں میں رغبت ومیلان پیدا ہوتا ہے اور دیکھا دیکھی اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی تعداد سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں اور پھر کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔افراد اگر کم ہوں تو تنظیم سازی سہل اور آسان ہوتی ہے مگر جب افراد کار کی تعداد بڑھ جاتی ہے تو ترتیب وتنظیم بھی ناگریز ہو جایا کرتی ہے۔کیونکہ غیر منظّم اور غیر مربوط سرگرمیاں فوائد کم اور مصائب زیادہ پیدا کرتی ہیں۔کار دعوت وتبلیغ سے وابستہ افراد اور قوموں کے معمار اور مصلحین تو ہر دور میں موجود رہے ہیں مگر ان کی تعداد حالات وزمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ چند دھائیوں کے دوران اس کار دعوت وتبلیغ میں شمولیت کے رجحان میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اور لاتعداد افراد اس کام پر کمر بستہ ہو گئے ہیں مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کامیابیوں کا تناسب خاطر خواہ نہیں ملا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شمولیت کے عمل میں کچھ خامیاں موجود ہیں جن پر توجہ دینا اور ازالہ کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اصلاح کے لائق مسائل ومعاملات کی شکل وصورت اور ہیئت ونوعیت اپنی حد تک سنگین ہی سہی مگر ایک مبلغ ومصلح کی توجہ کو جب اپنی طرف کھینچتی ہے تو کسی نہ کسی حد تک متاثر بھی کرتی ہے۔صاحب ہمت واعیان اور مصلحین پہلے اس کے اثرات کا پوری طرح ادراک کرتے ہیں پھر تدراک کی تدابیر کو بروئے کار لاتے ہیں۔گو کہ عہد رسالت کے مسائل ومعاملات اپنی نوعیت کے حامل تھے مگر تھے اپنی ہیئت میں قوم اور معاشرے کے روگ وآزار ہی۔آپؐ نے عربوں جیسی ضدی اور ہٹ دھرم قوم کو جس طرح دھیرے دھیرے راہ حق وہدایت سے آشنا کیا یہ ہمارے لیے ایک بہترین نمونہ عمل اور شاندار مثال ہے۔آپؐ کی سیرت طیبہ، کار دعوت وتبلیغ اور امور رفاہ واصلاح کے تعلق سے حکمتوں اور اسرار کا ایک سدا بہار منبع وسرچشمہ ہے۔رب ذوالجلال نے بھی آپؐ کی داعیانہ ومصلحانہ حکمت عملی کی توثیق اور تحسین فرمائی ہے اور اسے فضل رحمانی سے تعبیر فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَا انۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ..... (الِ عمران:۱۵۹)

''(اے رسول معظم) اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہے کہ تمہاری طبیعت ان لوگوں کے حق میں نرم واقع ہوئی ہے، تو اگر تم درشت خو سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بکھر جاتے، تو آپ ان لوگوں سے درگزر کرتے رہیں، ان کے لیے استغفار کرتے رہیں اور ان کو اہم معاملات میں شریک مشورہ کرلیا کریں۔''

قرآن کریم نے متنوع اور متعدد اسالیب کے ساتھ ان حکمتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔عہد حاضر میں دعوت واصلاح کے عمل کے نتیجہ کے لیے ضروری ہے کہ حکمتوں اور اسرار پر مبنی ان اسالیب کی جانب توجہ کی جائے اور اپنے طریق عمل کو

اس کے تحت سنوارا اور نکھارا جائے۔ پھر ثانیاً دعوت و اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔ظاہر ہے کہ اس درک ومہارت اور فہم و بصیرت کا حصول ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔افراد مختلف المزاج ہیں اور اہداف مختلف الدراجات۔ چنانچہ درجہ بندی اور ترتیب و تنظیم ناگزیر شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ اسے مراد فرقہ واریت کا خاتمہ ہے۔

سب سے پہلے اس نکتے کو ملحوظ رکھا جائے کہ آپؐ نے چالیس برس کی عمر میں اعلان نبوت فرمایا اور کار دعوت وتبلیغ کی باقاعدہ شروعات فرمائی۔ابن ہشام کی روایت ہے:

فلما بلغ محمد رسولؐ اربعين سنة بعثه الله تعالىٰ رحمة للعالمين و كافة للناس بشيرا و نذيرا(۱۲)

''جب محمد رسول ﷺ چالیس برس کے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت اور تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا۔''

کرمانی لکھتے ہیں:

''جو بات ایک نبی کو عامۃ الناس سے بلند و بالا کرتی ہے وہ اُس کا ظاہر اور بے داغ کردار ہوتا ہے جس کا ثبوت، دعویٰ نبوت سے قبل، وہ اپنی روزمرہ زندگی میں دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوتا ہے۔''(۱۳)

آیت کریمہ کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُراً مِنْ قَبْلِهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس:۱۶)

''اس سے پہلے کی ایک عمر میں نے تمہارے درمیان گزاردی ہے تو کیا تم عقل و دانش نہیں رکھتے۔''

حکمت الٰہیہ کے تحت یہ چہل سالہ حیات مبارکہ بھی کار دعوت وتبلیغ کے لیے مناسب تیاری و تربیت کو یکجا و یکسو کرنے پر صرف ہوتی رہی۔اس طرح کامیابی کے امکانات اور مواقع اور بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس نکتے کو نظر انداز نہیں کر سکتے جس میں انبیاء کرام کے بکریاں چرانے کے عمل کا تذکرہ آیا ہے۔محدثین اور سیرت نگار اپنے اپنے مقام پر اس بات کا ذکر کرتے آئے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے عہد شباب کے معمولات میں ایک عمل بکریوں کو چراگاہ تک لے جانا، چرانا اور دیکھ بھال کرنا بھی شامل تھا۔امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:

ما بعث الله نبيا الا رعى الغنم، فقال اصحابه: و انت؟ فقال: نعم، كنت ارعاها على قراريط لاهل مكة(۱۴)

''اللہ نے جو بھی نبی بھیجا اس نے بکریاں چرائی ہیں تو آپؐ کے اصحاب نے سوال کیا: اور آپؐ نے؟ آپؐ نے فرمایا: میں نے بھی قراریط کے بدلے اہل مکہ کے لیے بکریاں چرائی ہیں۔''

ابن ہشام کی روایت ہے:

ما من نبي الا وقد رعى الغنم قيل: وانت؟ يا رسول الله! قال: وانا.(۱۵)

''کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ اور اے اللہ کے رسول! آپؐ نے؟ آپؐ نے فرمایا: میں نے بھی چرائی ہیں۔''

اس عمل میں پوشیدہ حکمت کی وضاحت علامہ سہیلی نے ان الفاظ میں کی ہے:

انما جعل اللہ ھذا فی الانبیاء تقدمۃ لھم لیکونوا رعاۃ الخلق و لتکون اممھم رعایا لھم(۱۶)

''اللہ نے انبیاء کرام میں یہ روایت صرف اس لیے قائم رکھی ہے کہ انبیاء کی مناسب تربیت و تیاری ہو جائے تا کہ وہ خلق خدا پر فرمانروائی کر سکیں اور ان کی امتیں ان کی رعایا کے درجے میں رہیں۔''

ضرورت ہے کہ ہم مصلح اعظم نبی آخرالزمان ﷺ کے اصلاحِ معاشرہ کے عمل کی گہرائی اور طریقہ کار کو سمجھنے کی ازسرِنو سعی و کوشش کریں۔ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین کی اصلاحِ معاشرہ تحاریک کو بھی از سرِنو دیکھا جائے اور تقابل کرتے ہوئے قواعد وضوابط اور قوانین و اصول دریافت کیے جائیں۔

قرآن پاک نے امم سابقہ کے بھی کئی سربستہ راز کھولے ہیں جن کے اوپر زمانوں نے مٹی ڈال دی تھی اور جن تک رسائی کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ سب ہمارے لیے گراں قدر امثال و عبر ہیں اور امت مرحومہ کی رہنمائی کے لیے اپنے اندر حکمتوں کے خزانے سموئے ہوئے ہیں۔ اس طرح نہایت موثر و مضبوط اور بہت محفوظ ذریعہ سے ہمیں انبیائے سابقین کی دینی، ملی اور تبلیغی خدمات کی آگاہی بھی ملتی ہے اور امم سابقہ کے احوال و آثار کا پتا بھی چلتا ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں میں پائی جانے والی اعتقادی اور عملی خرابیوں کو دور کر کے ان کو ایک باقاعدہ دستورِ حیات مہیا کریں۔ شرافت و عظمت کو ان کے سامنے عملی صورت میں پیش فرمائیں اور سیدھی راہ پر ان کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ دین کی بنیادی قدریں یعنی اعتقادات تو مشترک ہیں البتہ حالات و زمانہ کے تغیر کے باعث شرائع بالخصوص اعمال و افعال کے پہلو مختلف رہے ہیں۔ اس طرح بنی نوع انسان کو مختلف زمانوں اور متعدد شکلوں میں دیا گیا یہ دستور فکر و عمل اپنی اصل کے لحاظ سے یکساں نوعیت کا اور کامل طور پر الہامی دستورِ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ... (الشوریٰ:۱۳)

''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور وضع فرمایا ہے جس کی تلقین نوح کو فرمائی تھی اور وہی کچھ آپ کی طرف وحی کیا گیا جس کی تاکید ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں پھوٹ کو راہ نہ دینا۔''

قرآن حکیم نے ایک اور نکتے پر بھی خاصا زور دیا ہے وہ یہ کہ انبیاء کرام اور رسولان عظام نے دعوت و اصلاح کا عمل اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی اجازت سے شروع فرمایا۔ ہم اپنی زندگی میں اس قاعدے سے استفادہ کے

لیے اقدامات کر سکتے ہیں۔ بالخصوص نچلی سطح پر درجہ بند کرتے ہوئے اس قاعدے کو لازم ہونا چاہیے۔ ہر کس و ناکس جب بغیر مناسب تیاری کیے اپنی مرضی سے اس میدان میں وارد ہوتا ہے تو مشکلات ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح رسولان عظام وانبیائے کرام نے باذن اللہ تعالیٰ جب بگڑی ہوئی انسانیت کے عقیدے اور عمل کی اصلاح کا آغاز کیا تو انسانوں میں سے کچھ نے اُن کی آواز پر لبیک کہا اور ان کو نجات دہندہ سمجھا اور مانا۔ لیکن وہ طبقہ اور اس کے وہ اہل کار جنہوں نے اپنے مقاصد رذیلہ کے لیے لوگوں کو گمراہ کر رکھا تھا، بلند ہوتے ہوئے آوازہ حق سے بپھر گیا اور اس سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اللہ رب کریم کی طرف سے انبیاء کرام کو عام اعلان رشد وہدایت کی اجازت اور اصلاح وتبلیغ کی شروعات کا حکم ملا تو اصلاح بین الناس کی مخالف قوت مزاحمت بن کر میدان عمل میں اتر آئی۔ مقابلے پر بالعموم چند ہی جاں نثار ہوتے تھے اور وہ بھی بے سروساماں حتی کہ اپنے مزاحمتی وجود کو بچائے رکھنا بہت مرتبہ مشکل ہو جاتا تھا۔ اہل حق کے نزدیک اسی مخالفت کے خلاف مزاحمت جہاد کہلاتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس مخالف قوت کی وضاحت ان الفاظ میں ملتی ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (الانعام:۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے انسانوں کے اور جنوں کے شیاطین میں سے کسی کو کسی نبی کا دشمن بنا دیا، وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کی طرف ملمع پر مبنی پیغامات بھیجتے رہتے اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا کر ہی نہ سکتے تو تم ان کے ان افترا پردازیوں میں لگا رہنے دو۔''

اس آیت کریمہ سے یہ امر صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں بھی حق کی آواز ابھرتی ہے یا انسانیت کی فلاح و اصلاح کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے تو شیطانی قوتیں تمام تر ہتھیاروں سے لیس ہو کر مخالفت ومزاحمت اور اہل حق کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے میدان عمل میں اتر آتی ہیں۔ حتی کہ انبیاء کرام کو بھی یہ میدان کبھی خالی نہیں ملا ہے۔

اہل حق اور باطل پرستوں کے درمیان معرکہ آرائی کا سلسلہ روز اول سے شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کے دور کے بت پرستوں میں خوب معرکہ رہا۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان معرکہ آرائی کی تفصیلات قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی اصلاحی تحریک اور فرعون کے مظالم اور مقابلے اور معرکے کا تذکرہ قرآن کریم کی کئی سورتوں میں نہ یہ کہ موجود ہے بلکہ دیگر انبیاء کرام کے مقابلے میں نمایاں اور کافی زیادہ ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے حکیمانہ طریقہ تبلیغ واصلاح کے باعث بے شمار لوگ باطل کے نرغے سے نکل کر پرچم حق کے سایہ میں آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا نعمت ہدایت سے مالا مال کیا اور جو اپنی سرکشی میں آگے بڑھنے پر ہی مصر ہے ان کو ڈھیل بھی ملتی رہی۔ انبیائے کرام اور ان کے متبعین پورے اخلاق ومحبت کے ساتھ محنت شاقہ کی منزلوں کی پیمائش کی۔ برداشت اور صبر وتحمل کا دامن کبھی ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پایا اور علمی وعملی دلائل، افرادی قوت کے

ذریعے اشاعت حق کے عمل میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔رسولان عظام اور انبیائے کرام علیہم الصلوت والتسلیمات کی اصلاح معاشرہ ان تحاریک کے مقدمہ کو پڑھنے سے ہی جو چیز نمایاں ہو جاتی ہے وہ ہے نعمت اخلاص وللّٰہیت ۔حتی کہ ابلاغِ حق کی راہ کی بے پناہ مشکلات کے باوجود بندگان خدا سے کسی قسم کے اجرومعاوضہ یا دادو تحسین کی طلب بھی کہیں نہیں پائی جاتی۔سورۃ الشعراء کی چند آیات میں انبیائے کرام کی دینی،ملی،تبلیغی اور اصلاحی خدمات کا تفصیلی ذکر بالترتیب ایک ساتھ آیا ہے۔ان ذوات قُدسیہ نے اپنے تعارف کے ساتھ جو خاص بات لوگوں پر واضح فرمائی وہ یہ ہے:

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo (الشعراء:۱۰۹)

''اور میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا،میرا اجر اس ذات پر ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

یاد رہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے تقریباً ساڑھے نوسو سال تبلیغ فرمائی۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَo فَاَنجَيْنَاهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنَاهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَo (العنکبوت:۱۴۔۱۵)

''اور بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان میں ساڑھے نوسو سال تک (تبلیغ کرتے) رہے،تو ان لوگوں کو طوفان نے غرق کیا اور وہ ظالم تھے تو ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچا لیا اور اس کو سارے جہانوں کے لیے نشانی بنا دیا۔''

ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا قوم میں تشریف لانا اور تبلیغ کرنا،ظالموں کا حال وانجام اور اطاعت کرنے والوں کا منزل عافیت پا جانا،متعدد کیفیتیں اور حالتیں بیان کردی گئی ہیں۔دیگر انبیاء کرام اور رسولان عظام بھی اپنے اپنے وقتوں میں تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے عمل میں یوں ہی شبانہ روز محنت فرماتے رہے۔اب جوان بزرگ ہستیوں کی سنگت ورفاقت اختیار کر لیتا اس کی دنیا وآخرت سنور جاتی اور جو نافرمانی پر اڑا رہتا وہ برے انجام تک پہنچے بغیر نہ رہتا۔قرآن کریم نے ان حالات وواقعات کو امت محمدیہ کی عبرت پذیری اور سبق آموزی کے لیے مختلف مواقع پر اور مختلف پیرائے ہائے اظہار میں بیان کیا ہے تاکہ امت محمدیہ کے لوگ اہل حق وسعات کے راستے پر چلیں اور برے انجام کے خوف سے نافرمانوں کی روش اختیار کرنے سے باز رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی اصلاح وفلاح کے اس مسلسل عمل کے آخری سرے پر اپنے آخری نبی رسول،محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کو جب معبوث فرمایا تو جہالت وگمراہی کا ایک مرتبہ پھر پوری طرح سے راج قائم تھا اور دنیا کی تقریباً ہر برائی یہاں موجود تھی۔اس کی وجہ بھی تھی۔عرب قدیم وقتوں سے بین الاقوامی تجارت سے منسلک تھے۔مشرق ومغرب میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔فطری سی بات ہے اس طرح کے اختلاط کی تاثیر دوطرفہ ہوتی ہے۔اچھائی اور برائی دونوں کی درآمد و برآمد کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ایک عام فہم مثال یہ ہے کہ ہندوستان کے روایتی لباس میں سے شلوار پہننے کی روایت اسی راہ سے عرب پہنچی اور لفظ ''سلوار'' معرب ہو کر ''سروال'' ہوا ہے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اچھی اور بری دونوں روایات

کے در کھلے ہوئے تھے۔ اسی طرح عربوں نے بت پرستی ملک شام سے درآمد کی تھی۔ بنوخزاعہ کے عہد ولایت کعبہ میں یہ بدعت ان میں داخل ہوئی۔ بنوخزاعہ کے ایک سردار عمرو بن لحی کے تعلق سے مبارکپوری لکھتے ہیں:

''اس شخص نے ملک شام کا سفر کیا۔ دیکھا تو وہاں بتوں کی پوجا کی جارہی تھی۔ اس نے سمجھا یہ بھی بہتر اور برحق ہے کیونکہ ملک شام پیغمبروں کی سرزمین اور آسمانی کتابوں کی نزول گاہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ ہبل بت بھی لے آیا اور اسے خانہ کعبہ کے اندر نصب کردیا اور اہل مکہ کو اللہ کے ساتھ شرک کی دعوت دی۔'' (۱۷)

آپؐ جغرافیائی اعتبار سے زمین کے اس حصے میں پیدا ہوئے تھے جو ان وقتوں کی گنجان آباد دنیا کے وسط میں واقع تھی اور جہاں سے انسانی آبادی کے ان قدیمی اور بڑے مراکز تک بحری اور بری دونوں راستوں سے باآسانی رسائی ہوسکتی تھی اور متذکرہ بالا حقائق و واقعات کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آباد دنیا کا یہی ایک ایسا گوشہ تھا جہاں دنیا جہاں کی خرابیاں یکجا ہوگئی تھیں۔ حالانکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے سب سے پہلے عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ (۱۸) مگر آج وہی مقام تھا کہ فتنہ وفساد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لہٰذا ان تمام برائیوں اور خرابیوں کی اصلاحی مشق پر مبنی عمل بنیادی طور پر رہتی دنیا اور سارے عالم کے لیے ایک مفید عام نمونہ عمل بننے کی اپنے اندر پوری صلاحیت سموئے ہوئے تھا۔

اصلاح معاشرہ کا عمل ہو یا کسی مرض کا کامیاب علاج، دونوں میں کامیابی اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب مصلح یا حکیم اپنے زیر اصلاح قوم یا زیر علاج شخص کی عادات واطوار اور نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو۔ اسی طرح ایک طبیب حاذق کو کارآمد نسخہ لکھنے کے عمل میں اس وقت آسانی ہوتی ہے جب مریض کے مرض کی صحیح اور درست تشخیص ہوجائے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ نبی آخرالزماں ﷺ کے اصلاحِ معاشرہ کے عمل کی ترتیب اور طریقہ کار اور اصلاحِ انسانیت کے سب سے بڑے اصلاحی منشور و دستور کی حقانیت وعظمت کا تعارف باختصاص پیش کیا جائے آپؐ کی ولادت باسعادت سے پہلے عرب معاشرے کے عمومی حالات پر نگاہ ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس معاشرے کی ان خرابیوں کو نشانزد کیا جاسکے جن کی اصلاح کی ضرورت پیدا ہوچکی تھی۔ نیز بیت اللہ شریف کی تاریخی حیثیت تبدیل کیونکر ممکن ہوئی؟ اور یہ امر بھی واضح ہوجائے کہ نبی آخرالزماں ﷺ کو کس ماحول ومزاج کی حامل قوم کی اصلاح کی ذمہ دار سونپی گئی تھی۔ اس حقیقت تک رسائی کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقط جہالت کہہ کر آگے بڑھ جانے کی بجائے اس کیفیت وحالت کی اصلیت وحقیقت پر توجہ کرلی جائے نیز اس مخفی قوت اور ان اسباب ومحرکات کا بھی کچھ تذکرہ کرلیا جائے جو ایک اچھے بھلے اور ہوشمند انسان کو دھیرے دھیرے تباہیوں کی راہ پر ڈال دیتے ہیں اور اس حد تک عادی بنا ڈالتے ہیں کہ واپسی کے سبھی راستے مسدود ہوکر رہ جائیں۔ قرآن حکیم نے اس باب میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا بلکہ ان پراسرار قوتوں اور ان کے عزائم وارادوں کو بھی طشت ازبام کردیا ہے۔ دشمن نگاہوں کے سامنے ہو اور اس کے ارادے بھی معلوم ہوں تو اس کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان سے بچا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ... (الاعراف:۲۷)

''اے اولادِ آدم خبردار شیطان تمہیں کسی صورت فتنہ میں مبتلا نہ کر سکے۔''

آگے فرمایا:

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ٥ (ایضاً)

''وہ اس کا کنبہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔اب سوال یہ ہے کہ شیطان کی قوت و اختیار کا منبع و سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے:''

قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ٥ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ٥ (الاعراف:۱۴۔۱۵)

''اس (شیطان) نے کہا: مجھے قیامت تک کی کھلی چھوٹ دے دے۔اللہ نے فرمایا: جا تجھے چھوٹ ہے۔''

پھٹکارے جانے پر شیطان انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر بارگاہ خداوندی میں التجا کرتا ہے کہ مجھے قیامت تک کے لیے کھلی چھوٹ دے دے کہ میں جو چاہوں کر سکوں۔اللہ تعالیٰ نے اسے چھوٹ دے دی۔انبیاء کرام کا مقصد پاکیزہ، سراپا خیر اور شرافت و کرامت سے عبارت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو خود اذن عطا فرمایا۔جبکہ شیطان کے ارادے شیطانی تھے تو اس کے اپنے مانگنے سے ہی اسے اس کی مطلوبہ چیز ملی۔وہ شیطانی ارادے کیا تھے؟ قرآن حکیم نے اس کے مکر و فریب اور دجل کے ایجنڈے کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے:

وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا٥ وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ... (النسآء:۱۱۸۔۱۱۹)

''اس (شیطان) نے کہا: میں ضرور تیرے بندوں میں سے اپنا طے شدہ حصہ لوں گا اور ضرور ضرور میں ان کو راہ راست سے ہٹا دوں گا اور ضرور انہیں آرزوئیں دلاؤں گا اور ضرور میں ان پر حکمرانی کروں گا تو وہ چوپایوں کے بھی کان کتریں گے پھر وہ ضرور اللہ کی خلق (فطرت) کو بدل ڈالیں گے۔''

اس نے علانیہ کہہ دیا کہ اللہ کے بندوں میں سے کچھ کو اپنا بندہ بنا لوں گا۔اللہ نے ان کو پاکیزہ اور فطرت اسلام پر پیدا کیا ہے تو میں ان کو ایسا کر دوں گا کہ شیطنت کے رنگ میں رنگ کر رہ جائیں گے۔یہی شیطان اور اس کی بندگی اختیار کر لینے والے نوع بشر کے افراد انسانی ماحول و معاشرے کو راہ راست سے ہٹا کر دور لے جاتے ہیں، توازن کو بگاڑ دیتے ہیں اور فتنہ و فساد کو فروغ دینے میں لگے رہتے ہیں۔متذکرہ بالا آیت کریمہ میں اس کے ایجنڈے کے نکات بہت واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں۔دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور انبیاء کے ذریعے ہر دور کے انسان کے لیے اپنے احکامات اور پیغامات کو تازہ کیا ہے۔صراط مستقیم کو واضح شکل میں لوگوں کے سامنے لایا گیا اور احکام شرع کے ساتھ ساتھ

نوعِ بشر کو سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ دیا ہے۔اس کو ارادہ اختیار بھی عطا فرمایا ہے۔اب ہر انسان کے لیے دنیا دار العمل ہے اور آخرت کو دار الجزا قرار دے کر ہر شخص کو اپنے ہر کیے کی جوابدہی کا پابند بنا دیا ہے۔اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک خیر کا اور دوسرا شر کا۔وجہ خواہ کوئی بھی ہو کوئی بھی اچھا بھلا آدمی جس طرح کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی معاشرہ بھی بہت دفعہ مختلف وجوہ کے باعث فکری و عملی عوارض اور امراض کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔جس طرح انسانی صحت کا دھیان رکھنے کے لیے ہر دور میں بڑی تعداد میں جسمانی امراض کا علاج کرنے والے معالجین موجود رہتے ہیں۔ضروری ہے کہ فکری و عملی امراض کی صحیح تشخیص کرنے کی اہلیت، ان کے ضرر و فساد کی حقیقی معرفت اور ان کے تدارک اور سدباب کے عمل میں مہارت رکھنے والے مصلحین بھی نہ یہ کہ ہر دور میں بڑی تعداد میں موجود رہیں بلکہ مستعد رہ کر معاشرے کے افراد کو شخصی یا اجتماعی طور پر ان راہوں کی طرف جانے سے روکتے رہیں جو آیت متذکرہ بالا میں بیان کردہ شیطانی ایجنڈے کے نکات سے کسی طرح سے آلودہ و متاثرہ اور فساد زدہ ہوں۔یہی لوگ مصلح اور مبلغ کا کردار نبھاتے ہیں جو بنیادی طور پر انبیاء کرام اور رسولان عظام کا کردار ہے۔آپؐ کی حیات طیبہ پر اور نورِ حق و ہدایت کے عام کیے جانے کے عمل پر غور کیا جائے تو چند قیمتی اصول ہاتھ میں آتے ہیں۔ہماری دانست میں ہمارے عہد کے مصلحین و مبلغین کے لیے بھی وہ ایک مشعل راہ ہیں۔ان اصولوں میں سب سے اہم علم و ادراک اور فکر و فہم کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

بعثت رسول ﷺ سے پہلے لوگوں میں علم نافع کی سمجھ بجھ چکی تھی۔انسان سوچتا تو ضرور تھا لیکن اس کی سوچ و فکر میں خیر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔سارا زور فروغ فتنہ و شر، ظلم و فتنہ بازی پر لگایا جاتا تھا۔ایسے حالات کسی بھی معاشرے کے مجموعی ماحول کو تباہی کی جانب دھکیل دیا کرتے ہیں اور انسانیت اور اقوام کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوا کرتے ہیں۔ظلم یہ ہے کہ یہی لوگ جو انسانیت کو رسوائی اور تباہی کی طرف دھکیل رہے ہوتے ہیں اپنے ہر عمل کو نہ یہ کہ حق بجانب سمجھتے ہیں بلکہ راہ راست پر چلنا ان کے نزدیک ایک نادانی بن جاتا ہے۔دوسروں کو بھی نادانی و ناسمجھی کا طعنہ دیا کرتے ہیں۔یہ بنیادی طور پر سوچ و فکر کے بگاڑ کے باعث صورت حال جنم لیتی ہے۔اس کا علاج فقط علم و ادراک اور فکر و فہم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کروانے میں ہی مضمر ہے۔چنانچہ آپؐ کو بے راہ روی کے شکار معاشرہ کی اصلاح کے لیے جو دستورِ حیات قرآن کریم کی صورت میں عطا کیا گیا اس کی پہلی وحی میں نہ تو عقیدہ کی بات تھی نہ عمل کی بلکہ اس وحی میں رب ذوالجلال کے احسان عظیم کے طور پر پڑھنے، علم، تحقیق اور ذرائع علم پر زور دیا گیا۔

امت مسلمہ کے دیگر اقوام سے پیچھے رہ جانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ امت نے اجتماعی طور پر فضول چیزوں میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کیا ہے اور علم و تحقیق میں امت کو سخت ناکامیوں اور محرمیوں کا سامنا رہا۔ان محرمیوں سے نکلنے کی سبیل یہی نظر آتی ہے کہ امت مسلمہ اپنے اندر اُن لوگوں کی مکمل سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرے جو علم و بصیرت اور تفکیر و تحقیق کے میدان میں ملکہ و جوہر رکھتے ہیں۔

اگلی جس بات کا لحاظ بے حد اہم ہے وہ ہے تدریج۔اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کا اقتضا ہے کہ کائنات کی ہر شے

بتدریج ہی پروان چڑھتی اور تکمیل کے مراحل عبور کرتے ہوئے زوال کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پھر ہوتے ہوتے فنا کے مقام تک پہنچتی ہے۔انسان بھی اپنے حالات ومعاملات میں فطرت کے اسی اصول کے زیر اثر اور اس کا پابند ہے۔قدرت کی طرف سے ہمیں جو نظام حیات دیا گیا ہے اس کا منبع وسرچشمہ یعنی قرآن حکیم بھی بتدریج مکمل ہوا۔آپؐ کے عہد میں بھی جملہ عقائد واعمال اور لوگوں کے باہمی معاملات میں اصلاح کا عمل بتدریج ہی ہوتا رہا ہے۔نزول قرآن،ان کے احکامات ومنہیات،عقائد،عبادات،غرض سب چیزوں کی تکمیل میں تدریج نمایاں نظر آتی ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اسلام کی جملہ تعلیمات میں تدریج ایک روح کی حیثیت رکھتی ہے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔تدریج درحقیقت سوچنے، سمجھنے، پرکھنے، موزوں ومناسب طریقہ کار کی جستجو کا نام ہے اور ایک منظّم وماہر جماعت تیار کرنے اور پورے عزم وحوصلے کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے وسیع مواقع فراہم کرتی ہے۔

تدریجاً اصلاح کے سبھی حامی بھی نہیں۔کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔مگر اس حکمت عملی کی مخالفت ہمارے نزدیک جدت پسندی اور غلو سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ شدت کامیابی کے امکانات کو محدود بلکہ بہت سی صورتوں میں معدوم کردینے کا باعث بن سکتی ہے۔تقی الدین نبھانی نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظامِ حکومت'' کا سترہواں باب ان الفاظ میں قائم کیا ہے:

اسلام کا یکبار اور ہمہ گیر نفاذ فرض ہے اور اسلام کا تدریجاً نفاذ حرام ہے۔(۱۹)

مصنف موصوف اس باب میں ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

''اسلام کا نفاذ جامع، ہمہ گیر اور یکبار ہونا چاہیے، تدریجاً نہیں۔اسلام کا تدریجاً نفاذ اسلام کے احکامات کے بالکل متناقض ہے۔''(۲۰)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عموماً اسلام کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے۔یہ حقیقت حال کی ایک غلط تعبیر اور مغالطہ آرائی ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے پہنے ہوئے لباس کو دوبارہ پہنانے کی سعی کی جائے۔ یہاں صورت بہت مختلف ہے کمسنی کے اترے ہوئے کپڑے عالم شباب میں یکبارگی پہنانے کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ سب کو معلوم ہے۔معاشرہ بھی وقت کے ساتھ اپنا رنگ اور اپنی کھال بدلتا ہے۔جونئی کھال چڑھی وہ اسلامی تعلیمات سے بڑی حد تک بیگانگی سے عبارت تھی۔اکیسویں صدی میں آکر یہ کھال گل چکی ہے اور دھیرے دھیرے نئی برآمد ہورہی ہے۔ہم عملی طور پر اسلامی تعلیمات سے جس قدر دور جاچکے ہیں واپسی کا عمل اب یکبارگی اور غیر فطری طور پر اس کی رفتار بڑھانا بھی سخت خطرات کو دعوت دینے کا عمل بن سکتا ہے۔

ہمارے عہد کی باریکیوں پر نگاہ رکھنے والے مصنفین اس بات کو تسلیم کرتے ہین کہ تدریج کو چھوڑ کر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

''جو لوگ از سر نو اسلامی زندگی کو اپنانے کی دعوت دے رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام کی فرماں

روائی قائم ہو تو ان کے لیے ضروری ہے کہ ہدف تک پہنچنے کے سلسلے میں تدریج کے قانون کو نگاہوں کے سامنے رکھیں۔ ہدف کی عظمت، امکانات اور رکاوٹوں کی کثرت کے پیش نظر بھی اس سے اعراض صحیح نہیں ہوگا۔'' (۲۱)

اسی طرح تدریج کی اہمیت کے سلسلے میں امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''دین الٰہی کی دعوت میں تدریج بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اگر اس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے بلکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس سے الٹا دعوت دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔'' (۲۲)

ہمیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات اور فکر و رائے سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب نظامِ حکومت سنبھالا تو شریعت اسلامی کی بالادستی کا سلسلہ کمزور پڑ چکا تھا۔ آپ نے دوبارہ نفاذ شریعت اور اصلاح معاشرہ کی جدوجہد فرمائی اور بے مثال کامیابیوں کی ایک لازوال تاریخ رقم فرمائی ہے۔ ایک مرحلے پر آپ کے جواں سال صاحبزادے نے اصرار کیا کہ آپ تمام احکامات اسلامیہ کو یکدم کیوں نافذ نہیں کر دیتے آپ نے اپنے سعادت مند بیٹے کو جو جواب دیا۔

''فیقول له عمر بلهجة الواثق المطمئن الی خطواته لاتعجل یا بنی فان الله ذم الخمر فی القرآن مرتین و حرمها فی الثلثه و انا اخاف ان احمل الحق علی الناس جملة فیدفعونه جملة و یکون من ذاک فتنة. (۲۳)

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بڑے اطمینان اور وثوق کے ساتھ بیٹے کو جواب دیا۔'' اے میرے بیٹے! جلدی نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ نے شراب کی دو مرتبہ مذمت فرمائی اور تیسری مرتبہ اس کو حرام کیا اور مجھے ڈر ہے کہ اگر تمام احکامات ایک ساتھ نافذ کر دوں گا تو لوگ اس کو یکبارگی رد کر دیں گے اور اس سے ایک بڑا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔''

اسی موقعہ پر آپ نے ایک تاریخی جملہ بھی ارشاد فرمایا تھا، آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''جس نے بدبودار کیچڑ میں زندگی بسر کر دی ہو اسے خوشبوؤں میں بسا ہوا ماحول ہلاک کر دیتا ہے۔'' (۲۴)

ایک عظیم مصلح اور مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ان تاریخی فیصلوں سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ اصلاح معاشرہ اور نفاذ اسلام کی تحریک کو بتدریج آگے بڑھایا جائے گا۔ مختصر یہ کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں اصلاح معاشرہ کے عمل میں تدریج پر مبنی حکمت عملی اختیار کیے جانے سے کسی کو انکار نہیں ہے اور بعد کے ادوار میں بھی صاحبان بصیرت نے تدریج کی راہ پر چل کر ہی کامیابی حاصل کی ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی اصلاح احوال کے عمل میں انہی نقوش کا احترام اور پیروی کرنی ہوگی۔

واقعاتی شہادتوں اور عملی اقدامات کے نتائج و اثرات کے مشاہدہ و مطالعہ سے بھی اسی امر کو تقویت اور تائید ملتی ہے کہ برائیوں میں بری طرح سے جکڑے ہوئے لوگوں کو بتدریج ہی اس ماحول سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ جہاں کہیں یکبارگی تمام اسلامی تعلیمات کے نفاذ کی کوشش کی گئی، نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اس ضمن میں قاضی منصور پوری نے ایک نہایت تلخ حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وال ویلرز زار روس مسلمان ہونے کو تیار تھا، اس شرط پر کہ وہ شراب کا پینا ترک نہ کرے گا۔اس وقت کے عالم نے اس شرط کو قبول نہ کیا۔زار مذکورہ (جو بت پرستی سے متنفر ہو گیا تھا) مایوس ہو کر عیسائی بن گیا۔اگر اس عالم کو ہدی محمدی ﷺ سے واقفیت ہوتی تو آج سلطنت روس میں قریباً سب مسلمان ہوتے۔''(۲۵)

حضور ﷺ کے ہاں اصلاح وتعمیر نو کے عمل میں یہ چیز بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہے کہ آپؐ نے ایک ایسے ذہن کی تشکیل فرمائی جو عملیت پسند ذہن تھا۔لوگوں کی فطری اور بشری حاجات وضروریات کی تکمیل کے لیے مناسب اقدامات تجویز فرمائے گئے۔لوگوں کو کسی بے جا مشقت اور اذیت سے دوچار نہیں کیا گیا۔رزق حلال کی تلاش کو عبادت کا درجہ دیا گیا اور اس کو فضل الٰہی سے تعبیر کیا گیا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ... (الجمعۃ:۱۰)

''تو جب نماز (جمعہ) ہو چکے تو پھیل جاؤ زمین میں اور اللہ کا فضل (رزق حلال) تلاش کرو۔''

رسول اکرم ﷺ کی عملی جدوجہد اور تعلیمات نے ایک ہوشمند اور عملیت پسند ذہن کی تشکیل کی ہے اور اس پر پوری توجہ اور زور صرف کیا ہے۔بحثیت انسان اس دین کے پیروکاروں کی جو بھی طلب وخواہش تھی جائز انداز سے پورا کرنے ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔خود انحصاری اور خود کفالت کے ساتھ غریبوں، مسکینوں کی دستگیری کی تعلیم وتاکید بھی فرمائی اور دینے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ سے افضل و بہتر قرار دیا گیا۔عمومی مشاہدہ ہے کہ آپؐ کے عہد میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر تربیت ہوتی رہی، مسلمانوں کو ستاروں پر کمند ڈالنے والا ذہن دیا جاتا رہا اور ناداری اور لاچاری سے مسلماوں کو بچنے دور رہنے کی ہدایات دی جاتی رہی۔

سماجی ناہمواریاں بھی ہمارے معاشرے کا ایک کرب انگیز روگ اور رستے ہوئے ناسور ہیں۔ہر سطح پر ان کے خاتمہ کے لیے تگ ودو کی جانی چاہیے خود ایک اچھے مبلغ کے لیے بھی اس بات کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ وہ پوری طرح سے لوگوں میں گھل مل جائے اور ان سے دور، جدا اور کسی معنی میں نمایاں اور ممتاز نہ رہے۔معاشرے میں عام طور پر عزت و ذلت کے خود ساختہ معیار طے ہو جایا کرتے ہیں۔ان میں سے بہت سے تو قطعی غیر انسانی بھی ہوتے ہیں۔خصوصاً کسب حلال کے تعلق سے لوگوں کے معمولات اور سرگرمیاں بہت مرتبہ معیوب گنی جاتی ہیں۔برصغیر میں ہم نے پیشہ کو ذات کی بنیاد بنا کر ایک طرف تو اپنے معاشرے میں تفریق وانتشار و تفرقوں و دوریوں کے بیج بوئے ہیں اور تو دوسری طرف صنعت و حرفت کے یہ میدان ہمارے اپنے لوگوں کے دست کش ہو جانے سے ایک ایک کر کے غیروں کے ہاتھ چلے گئے۔پھر ہمیں ان کا دست نگر ہو کر رہنا اور جینا پڑا۔مگر ذات پات کے اور معزز و شریف گھرانوں کے امتیازات اب بھی باقی ہیں۔بہت سے لوگوں کی نسلیں اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے کسب حلال کے لیے اختیار کیے گئے پیشے کے تعلق سے آج بھی معاشرے کا عتاب اور ذلت کا عذاب سہ رہی ہیں۔ممکن ہے کہ اس معاشرتی خرابی اور برائی کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے رویوں نے ہماری قومی زندگی کے رخ موڑ کر رکھ دیے ہیں اور ہماری اندرونی صفوں میں خلفشار

اور بداعتمادی کوفروغ دیا ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ قومی زندگی کے نظام درہم برہم ہوگئے۔ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں انبیاء عظام کی محنت وجدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کے اختیار کردہ پیشے بھی بیان فرمائے ہیں۔حضرت داؤد علیہ السلام کے پیشہ ورانہ اور صنعتی کمالات کواللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر فرمایا ہے۔ارشاد باری ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (سبا:۱۰۔۱۱)

''اور یقیناً ہم نے داؤدکواپنی بارگاہ سے ایک خاص فضل سے سرفراز کیا،اے پہاڑ واس کے تابع ہوجاؤاور پرند بھی اور ہم نے ان کے لیے لوہے کونرم کردیا کہ کشادہ زرہیں بناؤاور کڑیوں کومہارت سے بٹھایا کرواور کام کرو درست طور سے،جوکچھ تم کرتے ہو یقیناً اس سب سے آگاہوں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوہے سے جڑے ہوئے پیشہ داؤدی کواپنے فضل سے تعبیر فرماکرآپؑ کی مہارتوں کومحض اس لیے اجاگر فرمایا ہے کہ قرآن کا قاری اور عامل اپنی زندگی کوان عظیم ہستیوں کے طرز زندگی پر لے کر چلے،حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو صنف نازک کے مال مویشی کے لیے کنویں سے ڈول کے ذریعے پانی نکالتے ہیں اوران کے ریوڑ کوسیراب کرتے ہیں۔(۲۶)

حضرت ذوالقرنین کے تعلق سے بیان ہوا ہے کہ ایک ایسی قوم سے ان کا سامنا ہوتا ہے جوان کی بات سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ان لوگوں کوشکایت ہے کہ یاجوج ماجوج ان کوستاتے اور فساد پھیلاتے رہتے ہیں۔وہ لوگ خود پیشکش کرتے ہیں کہ ہم آپ کواس ضمن میں چندہ ادا کریں تو آپ ہمارے اوران کے درمیان ایک مضبوط ومستحکم دیوار کھڑی کردیں۔ آپؑ نے چندے کی پیشکش ٹھکرادی اوراپنے پلے سے دیوار تعمیر کی البتہ ان کے زور بازو کوضرور کام میں لاتے ہیں۔(۲۷)

ایک حفاظتی بند باندھنے کا عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کی اجتماعی مشکلات پر توجہ پہلے ضروری ہے کیونکہ بقا ارتقا سے پہلے ضروری ہے۔اسی طرح لوگوں کی مشکلات پر توجہ دیے بغیر آج بھی ان کے دل نہیں جیتے جاسکتے۔نہ ان کی سوچ بدل سکتی ہے اور نہ بدعملی اور بے اعتدالیوں سے وہ کنارہ کش ہوسکتے ہیں۔ان کے دلوں میں گھر کیے بغیر ساری سعی رائیگاں جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔فی زمانہ ان امور ومعاملات کا پاس ولحاظ بھی ضروری ہے۔معاشرتی اقدار عموماً مذہبی اقدار سے غذا لے رہی ہوتی ہیں اور جڑی رہتی ہیں۔یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ معاشرت مذہبیت کا رنگ اپنا لیتی ہے ایسے میں اس حصے کی نشاندہی ضروری ہوتی ہے جہاں سے شراور برائی معاشرت کی رگوں کے اندر اتر کر فساد پھیلانے میں کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔

یہ حضرت داؤداوران کے فرزند سلیمان علیہما السلام کی صنعت وحرفت اور علمی وفکری ترقی کی باتیں مسلمان قوم کے لیے معاشی ترقی کے میدان ہموار کرنے اور قومی وملکی استحکام کے لیے عظیم رہنمائی ہے۔سورہ النحل میں بیسیوں صنعتوں کا بیان ہے۔اسی طرح سورہ سباء میں بھاری صنعتوں کا ذکر ہے اور سورہ حدید میں لوہے کی عظمت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسے منفعت وترقی کی بنیاد قرار دیا گیا۔یہ سب آیات اوراحکامات مسلمان قوم کو یہ باور کرارہے ہیں کہ تمہیں تمام انسانوں کی بہتری وبھلائی اور رہنمائی کے لیے لایا گیا ہے۔دنیا پر تم حاکم اور ریاستی نظام کے رکھوالے بنوگے۔یہ تھی مسلمان قوم کی ذہن سازی تا کہ یہ قوم مفلس اور

قلاش نہ ہو بلکہ دنیا کی دولتیں سمٹ کر اس کے قدموں پر آ موجود ہوں۔ یہ اہل دنیا میں حسب حال وضرورت مال و دولت تقسیم کرتے رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ مزید جو نعمت لوگوں کو ملی اور شناخت و پہچان بنی وہ ہے ان کا نظریاتی اتحاد و اتفاق۔ اسلام اور بانی اسلام کی برکت سے باہم دست گریباں لوگ ایک ملت واحدہ بن گئے تھے۔ پوری امت مسلمہ کو جسم واحد قرار دیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ سے اصلاحی عمل میں جو سب قیمتی اثاثہ وسرمایہ قرآنی راہنمائی میں نظر آتا ہے وہ ہے امت مسلمہ کا آپس میں فکری اور نظری اتحاد و اتفاق۔ درحقیقت مکی زندگی میں آپؐ ایک قوم تیار فرما رہے تھے، جس کا نام مسلمان ہے اس میں ہزاروں لاکھوں ہوں گے جن کے قالب تو الگ الگ ہوں گے لیکن قلوب اور سوچ وفکر آپس میں ملے ہوئے یک جاں ہوں گے اور ہر نبی ورسول نے اولاً قوم سازی ہی پر توجہ دی آپؐ چونکہ ختم الانبیاء اور تمام مخلوق کی طرف رسول بن کر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کو آپؐ کے واسطے سے سب سے بڑا اور عظیم اصلاحی انقلاب مطلوب تھا۔ جس میں آفاقیت اور عالمگیریت کا پہلو نمایاں ہو، ان مقاصد عظیمہ کی تکمیل کے لیے آپؐ کو ایسی عظیم ٹیم اور جماعت کی ضرورت تھی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہر حکم کے سامنے گردن جھکا دینے والی ہو۔ خواہشات نفسانی کی پیروی کے تعلق سے ان کی اپنی مرضی اور پسند کا معاملہ نہ ہو بلکہ ہر کام اور معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر راضی ہوں حتی کہ اگر ان کی ذات کے حوالے سے کوئی حکم آجائے تو وہ دل و جان سے اسے تسلیم کرنے والے ہوں۔ یہ بات قرآن حکیم نے پوری طرح سے مسلمانوں پر واضح کردی تھی۔ ارشاد ہے:

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاO (النساء:۶۵)

''قسم ہے تمہارے پروردگار کی یہ لوگ جب تک باہمی تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں گے اور آپ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہیں کریں گے تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

وحدت وجمعیت اصولوں کی بنیاد پر استوار فرمائی گئی۔ حکم واطاعات کے امور بالخصوص اطاعت امیر کے معاملے میں عملی مشق سے گزار کر افراد کی شخصیت سازی کے تمام تقاضے پورے کردیے گئے۔ چنانچہ قرآن کریم کی چند آیات میں حضور ﷺ کی قائم جماعت کے ہر فرد کا یہی حال بیان ہوا۔ اس نہج پر تیار ہونے والی جماعت کے ہر فرد کی ذہنی اور فکری استعداد وارتقا کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ حسنات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے والے تھے۔ انہیں ایک دوسرے کے علم وفضل اور مقام ومرتبہ کا اعتراف بھی تھا اور احترام بھی۔ چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت مقدس میں اس جماعت عظیمہ کے افراد کا تعارف کچھ یوں بیان ہے، ارشاد پاک ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ... (الفتح:۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔''

آج امت مسلمہ کو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے درمیان قائم رشتہ مواخات کا جائزہ قرآنی آیات کی روشنی میں لیں اگر ایسا ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ امت میں پائی جانے

والی موجودہ تفریق اور دوریوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی موجودہ بے حالی بلکہ بدحالی، بادی النظر میں، قرآن حکیم میں وارد اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس صریح فرمان پاک سے اعراض وانحراف کا ہی کڑوا پھل ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والوں کو اس فرمان پاک کو حرز جاں ورد زبان رکھنے کی ضرورت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال:۴۶)

''اور اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور باہمی تنازعات کا شکار مت ہونا پھر تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا تک اکھڑ جائے گی اور صبر کرتے رہو یہ حقیقت ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

خلاصہ بحث:

نبی کریم ﷺ نے تاریخ انسانیت کا جو سب سے بڑا اور عظیم الشان اصلاحی انقلاب برپا کیا اس کی کامیابی کی بنیادی وجوہات اور اصول وضوابط کی ترتیب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے جس قوم اور معاشرہ کی ظاہری اور باطنی اصلاح کے لیے مبعوث کیا، اُس قوم میں پائے جانے والے ہزاروں عیوب ونقائص کے باوجود اُسی قوم کے درمیان رہ کر آپؐ نے سن شعور سے لے کر چالیس سال کی عمر مبارک تک بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ آپؐ ان کی عادات واطوار، حرکات و سکنات اور خامیوں وخوبیوں کو دیکھتے رہے۔ جس طرح کہ ایک طبیب حاذق مہلک امراض میں مبتلا اپنے مریض کے مرض کی نظر عمیق سے تشخیص کرتا ہے پھر اس کے لیے مناسب دوا تجویز کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں عجلت پسندی کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اس کی جگہ آپؐ نے بتدریج اصلاح کے لیے باقاعدہ ایک منظّم اور مربوط حکمت عملی وضع فرمائی اور پھر اس کے تحت اصلاح وتعمیر کے عمل کا آغاز فرمایا۔ آپؐ نے اعلان نبوت سے پہلے کسی قسم کی عام اصلاحی تحریک کا آغاز نہیں کیا، جب اعلان نبوت کے ساتھ اصلاح احوال کا آغاز فرمایا تو بھی تمام خرابیوں کی اصلاح کا عمل ایک ساتھ شروع نہیں فرمایا۔ بلکہ اولاً تطہیر وتزکیہ کے ذریعے نفوس قدسیہ کی ایک باہمت جماعت تیار فرمائی۔ بے پناہ رکاوٹوں کے باعث اس پر اچھا خاصا عرصہ لگا۔ جب ایک مناسب حد تک جدوجہد کرنے کے لیے افرادی قوت تیار اور مہیا ہو گئی تو انقلابی احکامات اور ارشادات کا نزول شروع ہوا۔ لہٰذا تیسرا اصول وضابطہ یہ نظر آتا ہے کہ آپؐ نے اصلاح معاشرہ کے عمل کو بتدریج آگے بڑھایا، عقائد، عبادات وغیرہم ہر چیز کی تکمیل میں تدریج کا عمل نمایاں اور واضح نظر آتا ہے۔

چوتھا بنیادی اصول یہ نظر آتا ہے کہ ایک عالمگیر اور آفاقی اصلاح معاشرہ کے لیے آپؐ نے جو افراد تیار فرمائے ان کے قلوب و اذہان آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ان میں گروہ بندی نہیں تھی بلکہ ایک مضبوط بٹی ہوئی رسی کے مانند آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے رہتے اور نظر آتے تھے حتی کہ اللہ رب کریم نے ان مخلص بندوں کے باہمی قلبی ربط وضبط کی خود تعریف فرمائی ہے۔ (الفتح:۲۹)

یہ وہ چند اہم اور بنیادی اصول ہیں جو پوری اصلاحی تحریک میں ہر کہیں کارفرما نظر آتے ہیں۔ آپ نے ایک بڑے اور کامیاب اصلاحی عمل کے لیے ان کو اختیار فرمایا۔ ہماری نظر میں اس وقت امت کا سب سے بڑا مسئلہ آپس میں نظریاتی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اعتبار سے گروہ بندی اور تقسیم ہی ہے۔ جس کے باعث محنتیں ڈوب رہی ہیں اور خاطر خواہ ثمر ہاتھ نہیں

آ رہا۔ یہ کمزوری دراصل بھرنے کے لیے رکھے گئے برتن کے پیندے میں ایک بڑے سوراخ کی مانند ہے۔ حاصل کی حفاظت کا مناسب اہتمام نہ ہوتو ہر سعی لا حاصل ہوتی ہے۔لہٰذا آج کی اہم ترین ضرورت ہے کہ افراد ہوں یا جماعتیں اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس امت سے ہر قسم کی تفریق اور گروہ بندی کو دور کرنا ہے اور ذہنی وفکری اعتبار سے ان بکھرے ہوئے لوگوں کوایک قوم بنانا ہے۔اس پہلو پہ بھر پور توجہ اور مناسب اقدامات اس امت کے حق میں سب سے زیادہ مفید اور سودمند عمل ہوگا۔ بلکہ ہماری دانست میں اصلاح امت کے اگلے مراحل کے آغاز میں ہی اس بات پر توجہ مرکوز رکھی جائے کہ فکری وعملی ہر اعتبار سے مسلمانوں میں یکجہتی وہم آہنگی کوفروغ دے کر ہی پھر سے اپنے پاؤں جمائے جاسکتے ہیں۔ (الانفال:۴۶) اور قومی وحدت جیسے عظیم نصب العین تک رسائی پیدا کی جاسکتی ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) امیر علی،سید،تاریخ اسلام،ص:۹،لاہور،الفیصل ناشران وتاجران کتب،غزنی اسٹریٹ، مارچ۲۰۰۹

(۲) مختار مسعود،آواز دوست،ص:۲۱۰،طبع ہفتم،لاہور،نقوش پریس، جولائی ۱۹۸۹ء (۳) الاحزاب:۲۱

(۴) بلیاوی،عبدالحفیظ،ابوالفضل،مصباح اللغات، مادہ''ص ل ح'' (۵) ایضاً

(۶) ابن ہشام،عبدالمالک،ابومحمد، السیرۃ النبویہ، برحاشیہ الروض الانف،جلد:۲،ص:۳۵۱،ملتان،عبدالتواب اکیڈمی، بلاسن طباعت

(۷) ندوی،ابوالحسن علی،منصب نبوت اوراس کے عالی مقام حاملین،ص:۱۰۹،(باردوم) لکھنؤ،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام،۱۹۸۷ء،

(۸) ڈاکٹر،ظفرحسن،سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت،ص:۲۵۰،(طبع دوم) لاہور،مکتبہ جدید،۲۰۰۳ء (۹) ایضاً

(۱۰) اصلاحی،امین احسن،اسلامی قانون کی تدوین،ص:۶۲،(طبع دوم) لاہور، فاران فاؤنڈیشن،۱۹۹۸ء

(۱۱) فاروقی، برہان احمد،ڈاکٹر،قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل،ص:۲۰۲،(طبع دوم) راولپنڈی،سروسز بک کلب،۱۹۹۶ء

(۱۲) ابن ہشام،جلد:۱،ص:۱۵۱

(۱۳) کرمانی،ضیاء الدین،ابدی پیغام کے آخری پیغمبرﷺ،ص:۱۶،۱۷(طبع اول) کراچی،امر پروسس،۱۹۸۴ء

(۱۴) بخاری،محمد بن اسماعیل،صحیح بخاری، ج:۱،ص:۳۰۱،کراچی،قدیمی کتب خانہ۱۹۶۱ء (۱۵) ابن ہشام،جلد:۱،ص:۱۱۲

(۱۶) السہیلی،عبدالرحمٰن بن عبداللہ،ابوالقاسم،الروض الانف،ص:۱۱۲،ملتان،عبدالتواب اکیڈمی، بلاسن طباعت

(۱۷) مبارکپوری،صفی الرحمٰن،الرحیق المختوم،ص:۵۷،لاہور،المکتبۃ السّلفیہ، بلاسن طباعت (۱۸) آل عمران:۹۶

(۱۹) نبھانی،تقی الدین،اسلام کا نظام حکومت،ص:۳۰۹،حزب التحریر،مطبع درج نہیں،سن اشاعت ۲۰۰۶ء (۲۰) ایضاً،ص:۳۰۹

(۲۱) قرضاوی،ڈاکٹر یوسف،الصحوۃ الاسلامیہ بین الجحود و التطرف،ص:۱۲۵،لاہور،مکتبہ تعمیرانسانیت،سن اشاعت ۱۹۸۷ء

(۲۲) اصلاحی،امین احسن،دعوت دین اوراس کا طریقہ کار،لاہور، فاران فاؤنڈیشن،سن اشاعت ۱۹۸۸ء،ص ۵۷

(۲۳) غزی،ڈاکٹر محمد صدقی، عمر بن عبدالعزیز مجدداً و مصلحاً، ریاض مکتبہ المعارف،سن اشاعت ۱۹۹۲ء،ص:۱۹۹ (۲۴) ایضاً

(۲۵) قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعلمین، ج:۱،ص:۱۸۴،(طبع اول) کراچی دارالاشاعت،۱۴۱۱ھ

(۲۶) القصص:۲۳،۲۴ (۲۷) الکہف:۹۳،۹۶